ڈاکٹر محمد ریاض

پندرھویں صدی ہجری میں جمالیاتی احساس
اور
اخلاقی ردّ و قبول[1]

پندرھویں صدی ہجری جس کی ابتدا ۱۰ نومبر ۱۹۸۰ء سے ہوئی ہے، بیسویں صدی ہجری کے آخری خمس اور اکیسویں صدی کی پہلی تین چوتھائی پر مشتمل ہے۔ ۶۲۲ء میں ہجری سال کا آغاز ہوا تھا۔ اس وقت سے اب تک کی تاریخ کے بعض حصوں پر امت مسلمہ کو افتخار ہے اور بعض حصوں سے ندامت اور گلہ و شکوہ۔ چودھویں صدی ہجری مجموعی طور پر عالم اسلام کے استقلال اور بیداری کی صدی تھی۔ اس صدی میں دنیائے اسلام کا بیشتر حصہ سیاسی طور پر آزاد ہوا۔ اب بالعموم مسلمان اپنے عالم گیر اتحاد کی ضرورت پر متوجہ ہیں اور اس سلسلے میں حالیہ سالوں کے دوران بعض مفید اور اہم اقدامات بھی ہوئے ہیں۔ پندرھویں صدی ہجری کے نئے امکانات گزشتہ صدی نے فراہم کیے ہیں۔ اس تناظر میں اس غلط فہمی کی طرف توجہ کریں جس کی رو سے چودھویں صدی ہجری کو قیامت خیز ہی نہیں، حقیقی قیامت برپا ہو جانے اور سلسلۂ حیات ختم ہو جانے کی صدی بتا کر عام مسلمانوں کو بہتر مستقبل کے لیے جدوجہد کرنے سے باز رکھنے کے لیے گمراہی پھیلائی جاتی رہی ہے۔ پندرھویں صدی ہجری کو بہرطور آنا تھا، اور آگئی۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ صدی کیا تحوّلات اور انقلابات لاتی ہے اور خصوصاً یہاں زیرِ بحث موضوع "جمالیاتی احساس اور اخلاقی ردّ و قبول" کو کس قسم کے ارتقا، تحوّل اور تنوع سے دوچار ہونا ہے۔

جمالیات

جمالیات یا زیباشناسی (AESTHETICS) کو فلسفۂ حسن یا فنونِ لطیفہ کا علم بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن اس کا جزوی یا کلی تعلق علوم و فنون کی کئی شاخوں کے ساتھ ہے[2]۔ جمالیات کے اصول اور ضوابط اس بات کے مظہر

---

[1] کراچی یونیورسٹی، ہجری کانفرنس میں ۷ فروری ۱۹۸۱ء کو پڑھا گیا۔

[2] اخلاق مطبوعہ اصفہان ترجمہ بدرالدین کتابی (ڈاکٹر پیرزادہ کی فرانسیسی کتاب کا ترجمہ) ۱۳۳۱ھ/۱۹۵۲ء، ص ۲ تا ۴

ہیں کہ متمدن انسان اپنی تاریخ کے ہر دور میں شعوری یا غیر شعوری طور پر اس علم کے معنویات کی طرف متوجہ رہے ہیں۔ انسان کے فضائل میں اس کی جمال دوستی اور زیبا شناسی بھی شامل ہے۔ یہ فضیلت صرف قوائے خمسہ کے استعمال سے ہی مربوط نہیں، اس میں ذوقِ استحسان کو خصوصی دخل ہے۔ جمالیات میں ثقافت اور اس کی شمولیت جیسے فنونِ لطیفہ پر ہی توجہ نہیں دی جاتی، خود "حُسن" اور اس کی ماہیت پر بھی غور و فکر کیا جاتا ہے[3] بطور ایک جداگانہ علم کے "جمالیات" کی تاریخ کوئی دو یا اڑھائی صد سال کی ہے[4] نشاۃ ثانیہ کے دور کے مغرب نے جن مخصوص موضوعات و مضامین کو وضع کیا اور متعارف کرایا، ان میں جمالیات بھی شامل ہے۔ جرمن فلسفی باؤم گارٹن (BAUM GARTEN) غالباً پہلا شخص تھا جس نے ۱۷۳۷ء میں "جمالیات" یعنی AESTHETICS کے عنوان سے اپنی کتاب شائع کروائی تھی۔ اس کا انتقال ۱۷۶۲ء میں ہوا[5] دیگر جمال شناسوں میں ہربرٹ اسپنسر، اسکر وائلڈ، سینٹ آگسٹائن، تھامس اکیوناس، ایڈمن برگ، بیکن، ہابس، مل، مور، کروچے، کولرج، شلر، شوپنہاور، اور بودلئیر کے نام معروف ہیں[6] جرمن مشاہیر کانٹ، گوئٹے، ہیگل اور تھیوڈور مومزن اگرچہ فلسفہ یا ادب کے مردِ میدان تھے، مگر جمالیات کے سلسلے میں بھی ان کے اقوال بڑے فکر انگیز ہیں[7]

جمالیات بطور ایک خاص موضوع اور مضمون بے شک دو ڈھائی سو سال قبل یورپ سے آغاز پذیر ہوا، مگر، جیسا کہ اوپر اشارہ ہوا، اس علم کی معنویات سے ضمیرِ انسانی کبھی خالی نہیں رہا اور دنیا بھر کے متقدم مشاہیر استحسانِ جمال کے سلسلے میں بڑی فکر انگیز باتیں کرتے رہے ہیں۔ علوم و فنون کا انتخاب اور تخصص بہر حال کوئی ایسا امر نہیں جو آخری مرحلے طے کر چکا ہو۔ چنانچہ اب بھی نئے نظام ہائے فکر و عمل وجود میں آتے ہیں، لہٰذا جمالیات کے نام سے ایک فلسفیانہ اور ذوق آمیز موضوع کا وجود میں آجانا قابلِ توجہ نہیں۔ جمالیات ایسے تجریدی اور ذوقی علم کی کوئی جامع و مانع تعریف پیش کرنا مشکل ہے۔ اتنا واضح ہے کہ اس

---

[3] تاریخِ جمالیات مولف ڈاکٹر نصیر احمد ناصر جلد اول ۱۹۶۲ء اور جلد دوم ۱۹۶۳ء، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور (مختلف صفحات)

[4] جمالیات، قرآنِ حکیم کی روشنی میں، (وہی مؤلف) نیشنل بک فاؤنڈیشن لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۲۳

[5] اقبال اور جمالیات (وہی مولف) اقبال اکادمی پاکستان ۱۹۶۲ء، ص ۲۰۰

[6] ادب میں جمالیاتی اقدار، ایک مطالعہ از ظہیر احمد صدیقی، مکتبہ الفاظ علی گڑھ ۱۹۷۹ء، ص ۱۸ تا ۵۳

[7] "مشاہیر جرمنی" ترجمہ سید سعید احمد، فیروز سنز پاکستان ۱۹۷۰ء میں ان مشاہیر کا ذکر۔

م کا رشتہ تعیینِ اقدار، ادبیات، ثقافت اور فنونِ لطیفہ سے زیادہ ہے مگر حسن و جمال کی پرکھ بہ حال
قدم ہے۔ ایبج پورباقر، فرانسیسی فلسفی اور نقاد امیل بوارک کی کتاب " جمالیات اور طریقہ ہائے
وم کی شناخت " کو پیشِ نظر رکھ کر لکھتے ہیں : " حسن و زیبائی وہ چیز ہے جس کی ہم آہنگی اور توافق سے
انی ذہن کے جملہ قویٰ جیسے حس، تخیل، عقل اور اخلاقی احساس کو تحریک ملے اور قوت پیدا کہ اس
حریک کو بخوبی محسوس کرے ۔"

یہ مصنف جمالیات کو اخلاقیات سے اور اخلاقیات کو فن سے وابستہ کرتا ہے۔ مغرب کے کئی دیگر نقطہ ہائے
نظر جیسے ماورائیت (TRANSCENTENALISM)، رومانیت (ROMANTICISM) اور نمودیت یا اظہاریت
(EXPRESSIONISM) وغیرہ جمالیات کے ساتھ ممزوج ہو گئے ہیں اور اس قسم کے دید و نظر سے ادبی
نقید اثر پذیر ہوتی ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ نظریاتی تنقید میں جمالیاتی نقطۂ نظر کی ضرورت اب مغرب و
شرق میں ہر کہیں محسوس کی جا رہی ہے۔ اطلاقی جمالیات (APPLIED AESTHETICS) کا تقاضا یہی ہے
کہ شعر و ادب، ثقافتی امور اور دوسرے فنونِ لطیفہ کی قدر و قیمت متعین کرنے میں " جمالیاتی احساس " سے کام
لیا جائے۔

قدیم یونان اور روم کے حکما کے اقوال و نظریات سے جمالیاتی نقطۂ نظر بخوبی مترشح ہے۔ اٹھارویں صدی
عیسوی میں مخصوص جمالیاتی اقدار منصۂ شہود پر آ جانے سے قبل دنیا بھر کے مفکرین کے ہاں " جمالیاتی نقطۂ نظر "
کی سی باتیں مل جاتی ہیں۔ مسلمانوں کے اندازِ فکر سے قطع نظر جس کا ذکر جداگانہ طور پر ہوگا، بیشتر مفکرین کا اسلوب
فکر " عینی " (IDEALISTIC) رہا ہے۔ وہ خیرِ مطلق اور حسن کے رابطہ پر غور کرتے رہے اور رومانی شعرا جیسے
ورڈز ورتھ، شیلے، کیٹس، ہائنا، گوئٹے اور شلر پر اس نقطۂ نظر کا بڑا اثر پڑا۔ اس طرح یہ تاثر دنیا بھر
کے شعر و ادب اور فنونِ لطیفہ پر اثر انداز ہونے لگا۔ اس اندازِ فکر نے موضوعی یا داخلی (SUBJECTIVE)
اور معروضی یا خارجی (OBJECTIVE) نقطہ ہائے نظر کو جنم دیا۔ مدتوں یہ بحثیں ہوتی رہی ہیں کہ حسن و زیبائی
موضوعی ہیں یا معروضی؟ پھر خاص قسم کی " علامات " ایجاد کی جانے لگیں جو معروف ادبی علوم و فنون یعنی بیان،
بدیع اور دوسرے صنائع ادبی کے علاوہ تھیں ؎۵ ادب برائے ادب، جمالیاتی احساس اور لذت گیری ...

؎۵ زیباشناسی و شناخت روشہائے ... ترجمہ ... ایبج پورباقر، اصفہان ۱۳۴۵ ھ/
۱۹۶۶ء، ص ۱۱

دیگر افکار اسی قسم کی جمالیاتی بحثوں سے منصۂ شہود پر آئے ہیں۔ مسلمان ممالک میں بولی جانے والی جملہ زبانوں کی ادبیات، میں جمالیات کے ارتقا پذیر نظریات کا انعکاس موجود ہے۔ فارسی اور اردو شاعری کا تاثر اگرچہ تماماً جمالیات کے معروضی یا موضوعی نظریات کے ہی تابع نہیں، مگر اس ضمن کی بعض دل پذیر تعبیرات ان شعرا نے بھی پیش کی ہیں۔ مثلاً مولانائے روم کے درج ذیل شعر کی معنویت دیکھیں اور علامہ اقبال کے انگریزی خطبات[9] میں اس کی توصیف:

بارہ از ما مست شد نے ما ازو　　قالب از ما ہست شد نے ما ازو

موضوعی جمالیات کی یہ کس قدر عمدہ مثال ہے۔ اقبال، شعرا اور صاحبِ ذوق افراد کو "حسن" کا صحیح قدر دان قرار دیتے ہیں کہ ان کے جمالیاتی استحسان سے "حسن" کی کیفیت اور ماہیت میں اضافہ نظر آنے لگتا ہے:

سینۂ شاعر تجلی زار حسن　　خیزد از سینائے او انوار حسن
از نگاہش خوب گردد خوب تر　　فطرت از افسون او محبوب تر

جمیل تر ہیں گل و لالہ فیض سے اس کے　　نگاہِ شاعرِ رنگیں نوا میں ہے جادو
مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو　　کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

حالی اور اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار "اعلیٰ تر معیارِ حسن" کی تلاش کے سلسلے میں کلاسیکی شان سے بہرہ مند ہیں:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں　　اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں
ہر نگارے کہ مرا پیش نظر می آید　　خوش نگارے است ولے خوشتر ازاں می بائست

جگر مراد آبادی کے اس شعر میں حسن معروضی بھی ہے اور موضوعی بھی:

حسن کے ہر جمال میں پنہاں　　میری رعنائیِ خیال بھی ہے

زرتشتی مذہب کے عناصر ثلاثہ حسنِ کردار، حسن گفتار اور حسنِ خیال بتلائے جاتے ہیں۔ غالب نے اپنے ایک بلیغ شعر میں کئی "حسن" یک جا کر دیے ہیں:

ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال　　خلد کا اک در ہے میری قبر کے اندر کھلا

منقولہ شعر غالب کے "کھلا" والی ردیف کے مشہور قصیدے میں سے نہیں بلکہ ایک غزل میں سے ہے جس کے

۹ے تیسرا خطبہ، ص ۷۱ (خطبات کی ۱۹۶۵ء کی اشاعت کی رو سے، مطبوعات شیخ محمد اشرف لاہور)

مقطع میں واقعہ معراج کی تلمیح کو بڑی خوب صورتی سے نباہا گیا ہے :

اس کی اُمت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند　　　واسطے جس شہ کے غالب گنبدِ بے در کھلا

حسن کے معروضی اور موضوعی علائم کا، اُردو شاعری کے حوالے سے، ذکر یہاں اس لیے ضروری ہے کہ "جمالیاتی احساس" کی ان شقوں پر توجہ رکھنا مفید ہے[۱۱۵] پھر حسن کی معروضی اور موضوعی صورتوں پر توجہ رکھنا بھی اہم ہے۔ حسن یا جمال اس ترکیب یا تعمیر یا تشکیل کی ایک مخصوص صفت ہوتی ہے جس سے کوئی معروض یا موضوع مرتبط ہوتا ہے اور اسے حسن کی اضافی یا وضعی کیفیت بھی کہتے ہیں۔ معروضی حسن میں افکار و مطالب، اشیا کے حوالے پیدا کرتے ہیں اور تاثرات، جذبات اور تصورات سے تشخیصِ حسن نمودار ہوتی ہے۔ "جمالیات" کے بارے میں دینِ اسلام کا نقطۂ نظر نہ موضوعی ہے نہ معروضی بلکہ ان دونوں نقطہ ہائے نظر کے بین بین ہے یعنی کائنات میں طبعی حسن موجود ہے مگر جمالیاتی احساس اس حسن میں اضافے کا موجب بھی بنتا ہے۔ اصغر گونڈوی کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ نظر آتی ہے کہ اس میں بعض ادبی نکات بڑی خوب صورتی سے نظم کیے گئے ہیں۔ ذیل کے چار اشعار دیکھیں۔ پہلے میں حسن کا معروضی نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے اور باقی تین میں موضوعی ارتسامات جلوہ گر ہیں :

بند ہو آنکھ اُٹھے منظرِ فطرت سے حجاب　　　لاؤ اک شاہدِ مستور کو عریاں کر دیں

ہیں نگاہِ شوق کی رنگینیاں چھائی ہوئی　　　پردۂ محمل اٹھا تو صاحبِ محمل نہ تھا

ہاں وادیِ ایمن کے معلوم ہیں سب قصے　　　موسیٰؑ نے فقط اپنا اک ذوقِ نظر دیکھا

حسن کے فتنے اٹھے میرے مذاقِ شوق سے　　　جس سے میں بے چین ہوں یہ خود مری آواز ہے

جمالیاتی احساس

جمالیاتی احساس، حسن و زیبائی کے اثرات قبول کرنے کا احساس ہے[۱۱۶] "جمالیات" کے عنوان کے تحت ہم نے جو مختصر بحث کی، اس سے شرق و مغرب کے جمالیاتی احساس کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ موجودہ

---

۱۱۵ جمالیات کے تین نظریے، مرتبہ ام۔ ام۔ شریف، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۲، ص ۱۱۱ اور اس کتاب کا انگریزی متن : STUDIES IN AESTHETICS مطبوعہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور ۱۹۶۴ء

۱۱۶ ادب میں جمالیاتی اقدار۔ ص ۱۱۱

زمانے کے رسل و رسائل اور آمد و رفت کی سہولتوں نے دنیا کو اس کی وسعتوں کے باوجود سکیڑ کے رکھ دیا ہے۔ مختلف ممالک ایک دوسرے کے ساتھ مفاہمت اور رابطے کے بھی آرزومند ہیں۔ اکثر مغربی ممالک معاشی ترقیات سے بہرہ مند اور سیکولر نظامِ حیات کے حامل ہیں۔ دوسری طرف مشرقی ممالک میں سے اکثر کا تعلق ہنوز تیسری دنیا سے ہے۔ مشرق و مغرب کا معاشی تفاوت شاید پندرھویں صدی ہجری میں ختم نہ ہو سکے۔ مغربی ممالک بہترین معیارِ زندگی، آزادی اور انتہائی ترقی سے بہرہ مند ہونے کے باوجود بعض معاشرتی خرابیوں سے دوچار ہیں۔ ان خرابیوں کی طرف اشارہ اخلاق والے حصے میں مناسب رہے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقی بے راہ روی، مقصدِ زندگی کا فقدان اور ہمہ گیر اباحی نقطۂ نظر (یعنی خوب و ناخوب اور روا و ناروا سے چشم پوشی) مغرب کے جمالیاتی احساس کو سخت دھچکا لگاتا رہے گا۔ علامہ اقبال نے کئی اشعار میں اس نقطۂ نظر کا اعادہ کیا ہے کہ حسن و زیبائی اور خوب و ناخوب کے بارے میں آزاد اقوام کی رائے قابلِ قبول ہوتی ہے، کیونکہ غلام اور مقلد قومیں ذوقِ انتقاد اور جمالیاتی احساس سے محروم ہوتی ہیں:

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی — جسے زیبا کہیں آزاد بندے، ہے وہی زیبا
بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر — کہ دنیا میں فقط مردانِ حر کی آنکھ ہے بینا

مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اقبال یا کوئی اور صاحبِ بصیرت مسلمان مغرب کی نام نہاد آزاد اقوام کی آرا کو بے چون و چرا قبول کر لینے کا حامی ہو سکتا ہے۔ اقبال کی مغرب دشمنی تو اب سب کو معلوم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اہلِ مغرب اپنی خواہشات اور ہوا و ہوس کے غلام ہیں، لہٰذا ان کا ذوقِ جمال اور جمالیاتی احساس معنوی طور پر فساد اور خرابیوں سے ہی دوچار رہے گا اور ان کے افکار کو آزاد اقوام کے دل پذیر احساساتِ جمال نہیں کہا جا سکے گا۔ بہتر حالات اور مادی و معنوی سہولتیں جمالیاتی احساس کو جلا بخش سکتی ہیں، اور حسن، ادبیات، ثقافت اور فنونِ لطیفہ کی اقدار کا بہتر تعین ممکن ہے مگر پندرھویں صدی ہجری میں اس کام کے امکانات سے بہرہ مند ہونے کی خاطر اہلِ مشرق خصوصاً مسلمانوں کو اپنے ذوقِ بصیرت سے استفادہ کرنا ہوگا۔ اہلِ مغرب کی تقلید سے کنارہ کرنا ہوگا۔ "جمالیات" کے موضوع پر مربوط باتوں میں ممکن ہے کہ پندرھویں صدی کا جدید دور کے بعض وقتی ارتقا اور تحول آتے مگر یہ موضوع بلکہ جملہ موضوعاتِ علم و فن فطرتِ انسانی سے مستنیر ہیں جو فطرتِ خداوندی کا ایک شعبہ ہے اور اس کی اصل و اساس کبھی نہ بدلے گی۔ قرآن مجید میں ہے: فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ط فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ط لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ط ذٰلِكَ

الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ق لا (سورہ الروم ۰ ۳۰) ۔ یہ فطرۃ اللہ یعنی خدا کی فطرت کیا ہے ؟ عقیدۂ توحید۔ مسلمانوں کو اپنے جملہ علوم و فنون کو اس طرح ترتیب دینا ضروری ہے کہ ان میں " توحید خداوندی " کی روح جاری و ساری ہو۔ مغرب کا جمالیاتی احساس ہمیں لذتِ توحید سے کیسے بہرہ مند کرے گا ؟ " او خویشتن گم است، کرا رہبری کند ؟ "[۱۱۲] پھر یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ علوم و فنون کی تقلید اور دوسروں کے چراغ سے اپنا چراغ جلانا اور ہے اور دوسروں کی تمدنی اور معاشرتی تقلید کرنا اور۔ اہلِ مغرب کے ترقی یافتہ علوم و فنون سے استفادہ کرنا قابلِ مذمت نہیں مگر اسلام کے اعلیٰ و ارفع اصولِ معاشرت کو ترک کر کے اہلِ مغرب کی فاسد تہذیب و تمدن کی نقالی بہر حال قابلِ مذمت ہے۔

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب — کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید — ضمیرِ پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف

جمالیاتی احساس ذوقِ استحسان ہے۔ مسلمانوں کے لیے یہ ایک ذوقی اور ذاتی ردّ و قبول اور پسند و ناپسند کا مسئلہ ہی نہیں، ان کے دین اور قومی کردار کا مسئلہ بھی ہے۔ لہٰذا جمالیاتی احساس ہو یا کوئی اور احساس، اس کا مقصد پندرھویں صدی ہجری میں " تقلیدِ فرنگی " کا بہانہ نہیں ہونا چاہیے مسلمانوں کو بالخصوص " فطرۃ اللہ " یعنی دامنِ قرآن سے ہی تمسک اختیار کرنا چاہیے۔

تا نبوت حکم حق جاری کند — پشت پا بر حکم سلطان می زند
معنی جبریل و قرآن است او — فطرۃ اللہ را نگہبان است او

جمالیات اور اسلام

دینِ اسلام، تقویٰ، پاکیزگی، طہارت، نفاست اور جمال و جلال کا مظہر ہے۔ سورہ نور کی پینتیسویں آیت " اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط " کے کلماتِ مبارکہ سے شروع ہوتی ہے، جمالیات کے بارے میں اسلام کے نقطۂ نظر کی ترجمان ہے۔ اس کا ترجمہ یوں ہے، " خدا آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسی ہے کہ گویا ایک طاق ہے جس میں چراغ ہے اور چراغ ایک قندیل میں ہے اور قندیل ایسی صاف شفاف ہے کہ گویا موتی کا سا چمکتا ہوا تارا ہے۔ اس میں ایک مبارک درخت کا

---

۱۱۲ ادب میں جمالیاتی اقدار . . . ص ۱۱۱

تیل جلایا جاتا ہے (یعنی) زیتون کا کہ نہ مشرق کی طرف ہے نہ مغرب کی طرف - اس کا تیل خواہ اسے آگ نہ بھی چھوئے، جلنے کو تیار رہے - روشنی پر روشنی ہے۔" . . . ایک دوسری آیت ہے : کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِی شَاْنٍ ۝ (سورۃ الرحمٰن : ۲۹) یعنی اللہ تعالیٰ ہر دن ایک نئی حالت میں ہے ـــ جس دین میں "خالقِ حسن" کا یہ تصور ہو، اس کے پیروؤں کے جمالیات کا ذوقِ استحسان کس قدر بلند ہوگا؟ حقیقت یہ ہے کہ اس دین کا تصورِ حسن و جمال، حرکی اور ارتقا پذیر ہے - تصور، تخیل، تعقل، تفکر اور تدبر کی جملہ قوتیں اس دین کی تعلیمات کے مطابق جمال آشنا بنتی ہیں -

دینِ اسلام ایک مکمل اور فطری ضابطۂ حیات ہے جس میں زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں بنیادی اصول اور تعلیمات موجود ہیں - اس عالمگیر دین کی یہ خصوصیات ہم مسلمان ہی بربنائے اعتقاد بیان نہیں کرتے، کئی غیر جانب دار مفکر اور محقق بھی اپنی تحقیقات اور تقابلی مطالعے کے ذریعے ان ہی نتائج پر پہنچے ہیں ـــ جمالیاتی مشاہدے، تجربے، احساس اور استحسان کے سلسلے میں قرآنِ مجید میں بار ہا تلقین آئی ہے - صفاتِ خداوندی کا بیان البتہ بے حد متنوع ہے - جمادات، نباتات، حیوانات اور انسانوں کے حسن کا بیان ہمیں بار بار جمالیاتی احساس اور استحسانِ حسن سے بہرہ مند کرتا ہے - اسلام، عالمِ غیب جیسے جنت کے حسن کو ہی مرتسم نہیں کرتا، عالمِ شہود کے مناظر کی طرف بھی انسانوں کو متوجہ کرتا ہے - قرآنِ مجید میں ہے: فَتَبٰرَکَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ ۝ (سورۃ المومنون : ۱۴) یہاں گویا انسان کی قوتِ تخلیق اور اس کے ذوقِ حسن و جمال کی طرف اشارہ ہے کہ :

بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت — جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی کے ایک افریقی مفکر اور ولی اس آگسٹینوس نے حسن کی ماہیت توازن اور ہم آہنگی بتائی ہے اور دنیا کے جمال شناس اس کا بار بار حوالہ دیتے ہیں - قرآنِ مجید توازن اور ہم آہنگی کو کائنات کے فطری حسن کا ایک اصول بتاتا ہے : الذی خلق سبع سمٰوٰت طبقاً ما تری فی خلق الرحمٰن من تفٰوت فارجع البصر هل تری من فطور ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیک البصر خاسئاً وهو حسیر (الملک : ۳، ۴) جمالیاتی استحسان کے سلسلے میں کئی آیات نقل کی جا سکتی ہیں، مثلاً بنی اسرائیل کو ایسی گائے کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا جس کا گہرا زرد رنگ دیکھنے والوں کے دلوں کو سرور دے : بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِیْنَ ۝

مرہ ۱ ۶۹)۔ سورہ نحل میں چوپاؤں کے چراگاہوں سے لوٹنے اور صبح کو چراگاہوں کی طرف جانے کے
ن مناظر کا بیان ہے، ولکم فیھا جمال حین تریحون وحین تسرحون (آیہ ۶)۔ اللہ
لی البتہ بار بار اس نکتے کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ کائنات کو یہ حسن، توازن، ہم آہنگی اور وحدتِ زیبائی خود
کی قدرتِ کاملہ کی عطا کردہ ہے اور اس کام میں کوئی دوسرا اس کا ہم کار اور شریک نہ تھا۔ یہی عقیدۂ
یدۂ اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے جسے پیروانِ اسلام کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ صوفیائے اسلام نے اس
یدے کی بعض شئون کو وحدت وجود، یا دوسرے ناموں سے پکارا۔ مقصد یہ کہ خدا خیر و تخلیق کا
چشمہ ہی نہیں، حسن و زیبائی کا سرچشمہ بھی ہے۔ کائنات کی ہر ذی روح یا بے روح چیز کا حسن
اصل ذاتِ باری تعالیٰ کے حسن سے ہی منشعب و منفک ہوا ہے:

حسن ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے — انسان میں وہ سخن ہے، غنچے میں وہ چٹک ہے
وہی اک حسن ہے لیکن نظر آتا ہے ہر شے میں — یہ شیریں بھی ہے، گویا یہ سوں بھی، کوہکن بھی ہے

ایک حدیث نبوی میں ہے: ان اللہ جمیل یحب الجمال۔ صفاتِ خداوندی کا استقصا کیا
ے تو ان سے جمال بھی ظاہر ہوتا ہے اور جلال بھی۔ اسلام کوئی خشک اور زاہدانہ دین نہیں جو "جمالیات"
کی فکری و فنی تعلیم سے عاری ہو۔ البتہ اس الہامی دین کی تعلیمات سے عظمت، شکوہ اور نیکی ہویدا
ہے۔ مغربی جمالیات کی دیانت، جنسیت، تشکک، الحاد اور بے مقصدیت کے عناصر اسلام کے
ریم جمالیات میں داخل نہیں کیے جا سکتے، لہٰذا پندرھویں صدی ہجری میں مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے نظامِ
فکر میں قرآنی جمالیاتی اصول اس طرح سمو ئیں کہ مسلمانوں کی ادبیات، ثقافت اور فنون لطیفہ سے دوسری
قوموں کا جمالیاتی احساس "خیر و خوبی" کی طرف مائل ہونے لگے۔ ایک جمالیات دان مسلمان نے یوں لکھا ہے:

"ثقافت" ارتقائے انسانیت کی آئینہ دار ہے۔ اس کا حسن، انسانیت کا حسن اور اس کی ترقی،
نسانیت کی ترقی ہے لیکن کسی قوم کی ثقافت کی ترقی اس کے افراد کی جمالیاتی حس اور جمالیاتی شعور کی بیداری
پر منحصر ہے۔ اس اعتبار سے جمالیات کا مطالعہ علمی اور عملی دونوں لحاظ سے انسانیت کے حسن دار تقا کے
لیے ناگزیر ہے۔ قرآن حکیم نے اس لیے جمالیات کی اہمیت و ضرورت پر بجا طور پر زور دیا ہے۔ وہ
انسان کو ظاہری اور باطنی، انفرادی اور اجتماعی ہر لحاظ سے حسن و خوبی کا پیکر دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کا ارشاد
ہے کہ باری تعالیٰ نے کائنات کی ہر شے کو انسان کے لیے حسن و خوبی کا پیکر بنایا اور پھر خود انسان کی شکل و

صورت اور فطرت کو حسین بنایا تاکہ وہ اس حسین و نظر افروز دنیا میں لذت و سرور اور کیف و طمانیت کے عالم میں زندگی گزارے اور اپنے سفرِ زندگی میں وہ راہ اختیار کرے جو حسین ہو تاکہ حسن و سرور کی اس منزلِ آخر تک پہنچ سکے جسے اس نے 'حسن المآب' اور 'جنت' کے ناموں سے تعبیر کیا ہے ۔ ۔ ۔ [۱۵] پس جمالیات اور ثقافت کے اس گہرے تعلق کے پیشِ نظر، اسلامی ثقافت اور اس کی ذیلیات جیسے فنونِ لطیفہ پر ایک نظر ڈالتے چلیں ۔

اسلام اور ثقافت و فنون لطیفہ

کلچر یا ثقافت کی کوئی جامع تعریف پیش کرنا مشکل ہے مگر اس کے مشمولات و محتویات، تہذیب و تمدن، آداب و رسوم، ادبیات اور فنونِ لطیفہ وغیرہ ہیں ۔ اسلامی ثقافت، اسلامی تعلیمات کی آئینہ دار ہے یعنی اس میں شر اور ناخوب کے بجائے، خیر اور خوب کے مظاہر دکھائی دیتے ہیں ۔ اسلام نے خیر و نیکی اپنانے کا ہی حکم نہیں دیا، اس کی حمایت و اشاعت کی تلقین بھی کی ہے ۔ مغربی ثقافت کے فساد کو دو یورپی مصنفوں نے اجاگر کیا ہے ۔ ایک اٹلی کے سائنٹیٹی تھے جنھوں نے انحطاط فرنگ کی داستان قلم بندکی اور دوسرے جرمن مصنف اسوالڈ شپنگلر جنھوں نے، زوالِ مغرب کو بیان کیا ہے ۔ علامہ اقبال نے اپنے انگریزی خطبات میں (شمارہ ۵ اور ۶) شپنگلر کے اس خیال پر گرفت کی ہے کہ اسلامی ثقافت، مجوسی ثقافت کی ایک صورت ہے ۔ اسلامی ثقافت قدیمیت اور جدیدیت کا امتزاج ہے ۔ یہ ثقافت عالمگیر اور ابدی نوعیت کی ہے ۔ یہ نہ زمانی ہے نہ مکانی ۔ ختمِ نبوت کا عقیدہ، اصولِ حرکت و اجتہاد، عقیدۂ توحید، مقصدیت، ادب و فن برائے زندگی اور تعمیرِ شخصیت اس ثقافت کے اہم ترارکان کہے جا سکتے ہیں ۔ اس ثقافت میں ایسے تمام اصول و آداب شامل کیے جا سکتے ہیں جو اسلام کی اساسی تعلیمات اور تعمیرِ شخصیت کے طریقوں سے متصادم نہ ہوں ۔ اقبال کا ایک تین شعری قطعہ بات کو مزید واضح کر دے گا :

ستارگان فضاہائے نیلگوں کی طرح — تخیلات بھی ہیں تابع طلوع و غروب
جہاں خودی کا بھی ہے صاحب فراز و نشیب — یہاں بھی معرکہ آرا ہے خوب سے ناخوب
نمود جس کی فرازِ خودی سے ہو وہ جمیل — جو ہو نشیب میں پیدا، قبیح و نامحبوب

---

[۱۵] جمالیات، قرآن حکیم ۔ ۔ ۔ ص ۳۰۴

لہٰذا واضح ہے کہ اسلامی ثقافت، فنونِ لطیفہ کے بامقصد اور حیات افروز ہونے کو مستلزم ہے یعنی:

سرود و شعر و سیاست، کتاب و دین و ہنر — گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عینِ حیات — نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ

حیدرآباد دکن سے 'اسلامک کلچر' نام کا انگریزی سہ ماہی مجلہ جب جنوری ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا تو اس کے پہلے شمارے میں ثقافتِ اسلامی کے موضوع پر دو اہم مقالے شائع ہوئے۔ یہ مقالے مجلے کے نام کی وضاحت ہی پیش نہیں کرتے، بلکہ وہ اسلامی ثقافت کے خدوخال اور اہلِ مغرب کی ثقافت اور اسلامی ثقافت کے تقابلی مطالعے کے مبیّن بھی ہیں۔ ایک مقالہ رسالے کے مدیر نومسلم محمد اسد (لیوپولڈ ویس) کا ہے اور دوسرا "اسلام لشمق" مقالے کے[1] مصنف محمد سعید حلیم پاشا ترکی کا فرانسیسی سے ترجمہ ہوا۔ "مسلمان معاشرے کی اصلاح" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ لکھتا ہے کہ اسلامی ثقافت، وحی الٰہی کی ہدایات پر مبنی ہے، اس لیے وہ گم راہی اور بے راہ روی سے مبرّا ہے۔ اس ثقافت کے علم سے گناہ، عدل و انصاف اور جملہ معاشرتی برائیوں کے سدباب کے امور ہیں۔ یہ ثقافت، قرآن و سنت کی تعلیمات سے منور ہے اور ہمیشہ لوگوں کو راہِ راست کی طرف راہ نمائی کرتی رہے گی۔ سعید حلیم پاشا مرحوم نے اسلامی ثقافت کے بارے میں جو کچھ لکھا، ان کی تحریر میں پانچ نکتے ذیل کی نوعیت کے ہیں:

۱۔ دینِ اسلام کی اصل الاصول عقیدۂ توحید ہے اور یہ عقیدہ اسلامی ثقافت کی بھی بنا ہے مسلمانوں کی کوئی ایسی ثقافتی سرگرمی محمود و پسندیدہ قرار نہیں دی جا سکتی، جس کو عقیدۂ توحید سے وابستہ نہ کیا گیا ہو۔

۲۔ اسلام اور مغربی ممالک کی ثقافتوں میں غیر معمولی فرق ہے۔ اسلام کی الہام آمیز ثقافت ارفع و اعلیٰ ہے جب کہ مغرب کے لوگوں کی ثقافت اپنی ظاہری چمک دمک کے باوجود فساد زدہ اور ناقص ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے کہ یورپ کے علوم و فنون سیکھنے اور وہاں کی ثقافت اپنانے کے فرق کو ملحوظ رکھیں۔ یورپ والوں کے علوم و فنون ضرور سیکھے جائیں مگر مسلمانوں کی یہ بدبختی ہوگی، اگر وہ اعلیٰ و برتر ثقافت کے امین ہونے کے باوجود یورپ والوں کے معاشرتی آداب و رسوم کے غلام بن جائیں۔

۳۔ دینِ اسلام نے، توحید و رسالت وغیرہ کے عقاید کی "عالم گیری" سے عالمِ انسانی کو نجات و رست گاری حاصل

---

[1] یہ مقالہ پہلے ۱۹۱۸ء میں ترکی کے رسالے سبیل الرشاد میں شائع ہوا تھا۔

کرنے کی دعوت دی ہے۔ انسانوں کی ثقافتی نجات اس بات میں مضمر ہے کہ وہ اسلامی ثقافت اپنا لیں ورنہ عالمِ انسانی موجودہ اخلاقی انحطاط و فساد سے نجات حاصل نہیں کر سکے گا۔

۴۔ اسلامی ثقافت کسی دینی پیشوائیت کی مؤید نہیں، لہٰذا پڑھے لکھے مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ روحِ دین کو سمجھیں اور نام نہاد ملاؤں کی تعبیرات و تاویلات سے گم راہ نہ ہوں۔

۵۔ اسلامی ثقافت کا لازمہ ہے کہ اسلام کا شورائی نظام نافذ کیا جائے اور اسلامی تعلیمات کو اجزا کی صورت میں نہ دیکھا جائے۔ کل کو اجزا میں دیکھنے سے کئی غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

سعید حلیم پاشا مرحوم کا یہ مقالہ مسلمانوں کے لیے جمالیاتی احساس اور اخلاقی ردعمل نیز مشرق و مغرب کی اقدار کے تقابلی مطالعے کے سلسلے میں پندرھویں صدی ہجری میں بھی لمحۂ فکریہ فراہم کرتا ہے۔ اس کی ابتدائی سطور کا ترجمہ یہاں نقل کر دینا نامناسب نہ ہوگا:

"مجھے اس امر سے کمال مسرت حاصل ہوتی ہے کہ خود میری زندگی میں مسلمان قومیں اپنے خوابِ غفلت سے بیدار ہو رہی ہیں اور اغیار کی غلامی کے طوق کو اتار پھینکنے کے لیے سرگرمِ عمل ہیں، کیوں کہ اس بیداری کے یہ معنی ہیں کہ ان میں حصولِ آزادی کے فریضے کا، جو ایک مسلم کا مقدس ترین فریضہ اور پیدائشی حق ہے، کماحقہٗ احساس پیدا ہو چکا ہے کہ کامل آزادی کے بغیر کوئی سچی مسرت اور حقیقی ترقی حاصل نہیں ہو سکتی۔ لیکن میری مسرت افسوس سے بدل جاتی ہے، جب میں دیکھتا ہوں کہ جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کے اکثر سرکردہ لیڈر اپنے ملکوں میں اس نظام کے رائج کرنے پر تلے ہوئے ہیں جو اہلِ مغرب کی بھونڈی نقالی سے زیادہ نہیں اور وہ اس زعمِ باطل میں مبتلا ہیں کہ مغربی دنیا کے تخیلات اور طریقِ کار کو اختیار کیے بغیر ہمارے احیا کی اور کوئی سبیل نہیں ہو سکتی۔ مسلم اربابِ فکر کی یہ ذہنیت مجھے نہایت ہی شاق گزرتی ہے، کیوں کہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حضرات اس کھلی ہوئی حقیقت کا بھی ادراک نہیں کر سکتے کہ دینِ اسلام نے خدائے واحد سبحانہٗ کی عبادت کے ساتھ ہمیں اخلاق و معاشرت کے اصول کا ایک مکمل دستور العمل اور ایک کامل نظامِ حیات بھی عطا فرمایا ہے اور یہ دونوں اس درجے لازم و ملزوم ہیں کہ ہم ایک کو ترک اور دوسرے کو اختیار نہیں کر سکتے کیوں کہ ان دونوں کی بنیاد عقیدۂ توحید باری تعالیٰ ہے۔ یہی عقیدہ تو ہمیں اس امر کا مکلف بناتا ہے کہ ہم خدائے واحد کی سچی عبادت کر ہی نہیں سکتے جب تک کہ ہم اس کے مقرر کردہ ضابطۂ اخلاق کو بے چون و چرا اختیار نہ کر لیں اور یہ حقیقت تاریخی طور پر مسلم ہے کہ مسلمانوں نے اپنی ترقی کے ہر دور میں اپنے تمدن کی عمارت حتی الوسع اسی اصول پر استوار کرنے کی

کوشش کی ہے اور مسلمانوں کی ہر جماعت اور ہیئتِ اجتماعیہ اسی اصول کی آغوش میں پروان چڑھی ہے۔[15]
فنونِ لطیفہ کئی ہیں جیسے موسیقی، مصوری، خطاطی، ادبیات، معماری وغیرہ۔ ان فنون کو زندگی کے لیے مفید بنا کر پیش کیا جائے اور ان سے تخریب اخلاق کا کام نہ لیا جائے تو اسلام کو ان پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اسلام کو البتہ مجسمہ سازی پر اعتراض ہے کیوں کہ اس سے شرک کی بو آتی ہے۔ بعض دیگر آلاتِ فنون کو مفید کاموں کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ فنونِ خطاطی و معماری اور ادبیات کی مختلف شقوں میں مسلمانوں کے کارناموں کا سب کو اعتراف ہے۔ اس قسم کے کارناموں سے مسلمانوں کے جمالیاتی احساس اور اخلاقی ردّ و قبول کا مسئلہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کی ثقافت اور ان کے فنونِ لطیفہ اس بات کے غماز ہیں کہ مسلمان ہر کام میں دینی تعلیمات کو مشعلِ راہ بناتے رہے ہیں۔ انھوں نے ابدی اہمیت کی حامل عمارات ہی نہیں بنائیں، ادبی علامات کے وہ روشن نقطے بھی پیش کیے ہیں جن پر مغرب کے جمالیات دانوں اور ادبی نقادوں کو اچنبھا ہوتا ہے۔ ایسی ایک علامت، "گلِ لالہ" کی ہے جس کی ادبی روایات مسلمانوں کی کئی زبانوں مثلاً فارسی، ترکی اور اردو سب میں منتقل ہوئی ہیں۔ اس ضمن میں ایک فرانسیسی نقاد اور محقق کا مبسوط مقالہ ہمارے پیشِ نظر ہے۔[16] انھوں نے گلِ لالہ کی مختلف اقسام کا ادبِ اسلامیہ میں انعکاس بتایا ہے۔ مسلمانوں نے اس پھول کی سرخی کو دردمندی کا مظہر ہی نہیں مانا، بلکہ اس کے حروف کو رنگِ مقدس دے کر اپنی معاشرت میں اس سے خوب اعتنا کیا ہے۔ لالہ کے حروف کی ترتیب بدل دینے سے اسمِ ذاتِ باری تعالیٰ "اللہ" بن جاتا ہے۔ لہٰذا ترکوں نے بالخصوص اپنی مساجد وغیرہ میں اس پھول کے نقش و نگار مرتسم کیے اور لالہ کا ذکر ترکانِ عثمانی کی معاشرت کا ایک اہم اصول رہا ہے۔ "گلِ لالہ" کی یہ بات من باب مثال ہے۔ جس کے نقوش ترکانِ عثمانی کے علاوہ ترکانِ تیموری یعنی برصغیر کے مغلوں کی کوچک تیموری یعنی MINIATURES میں افراط سے دیکھے جاسکتے ہیں۔ فارسی کے کئی شعرا نے گلِ لالہ کی بڑی دل آویز تعبیرات پیش کی ہیں اور بابا فغانی اور اقبال تو اسے اپنے اپنے مزارات کی زینت بھی بنانا چاہتے تھے:

هنوز سوزدم از داغ آرزوے تو دل — نہ بس کہ لالہ دمد از سرِ مزار مرا (فغانی)

حوالہ جات

۱۵ھ اللہ کی بادشاہت اردو ترجمہ سید ہاشمی فرید آبادی با وضاحت از مولانا محمد علی ایم اے مطبوعہ مکتبہ تعمیر انسانیت (اردو بازار لاہور)

۱۶ھ فرانسیسی ادیب [illegible] کے مقالے کا ترجمہ از [illegible] مجلہ دانشکدہ ادبیات و علوم انسانی مشہد شمارہ [illegible] ۲۷۶ - لالہ و اعداد، نیز اسی سے استفادہ میرا مقالہ مشمولہ "اردو" کراچی ابتہ اکتوبر ۱۹۷۰ء میں: گلِ لالہ کی ادبی روایت اور اقبال۔

چوں بیرم از غبار من چراغ لالہ ساز تازہ کن داغ مرا، سوزاں بصحرائے مرا
بخاکِ مرقدِ من لالہ خوشتر کہ ہم خاموش و ہم خونین نوائے است (اقبال)

(تقابل کے لیے ملاحظہ ہو تخلیقی ادب میں محمد ہادی حسین کا مقالہ "کلچر اور فنونِ لطیفہ" عصری مطبوعات کراچی ۱۹۸۰ء، نیز علامہ شبلی کی شعر العجم جلد چہارم)

(باقی آئندہ)

الفہرست

از محمد بن اسحاق ابن ندیم وراق اردو ترجمہ: محمد اسحاق بھٹی

یہ کتاب چوتھی صدی ہجری تک کے علوم و فنون، سیر و رجال اور کتب و مصنفین کی مستند تاریخ ہے۔ اس میں یہود و نصاریٰ کی کتابوں، قرآنِ مجید، نزولِ قرآن، جمع قرآن اور قرائے کرام، فصاحت و بلاغت، ادب و انشا اور اس کے مختلف مکاتبِ فکر، حدیث و فقہ اور اس کے تمام مدارسِ فکر، علمِ نحو، منطق و فلسفہ، ریاضی و حساب، سحر و شعبدہ بازی، طب اور صنعتِ کیمیا وغیرہ تمام علوم، ان کے علما و ماہرین اور اس سلسلے کی تصنیفات کے بارے میں اہم تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں واضح کیا گیا ہے کہ یہ علوم کب اور کیوں کر عالمِ وجود میں آئے۔ پھر ہندوستان اور چین وغیرہ میں اس وقت جو مذاہب رائج تھے ان کی وضاحت کی گئی ہے۔ نیز بتایا گیا ہے کہ اس دور میں دنیا کے کس کس خطے میں کیا کیا زبانیں رائج اور بولی جاتی تھیں اور ان کی تحریر و کتابت کے کیا اسلوب تھے؟ ان کی ابتدا کس طرح ہوئی اور وہ ترقی و ارتقا کی کن کن منازل سے گزریں۔ ان زبانوں کی کتابت کے نمونے بھی دیے گئے ہیں۔

ترجمہ اصل عربی کتاب کے کئی مطبوعہ نسخے سامنے رکھ کر کیا گیا ہے اور جگہ جگہ ضروری حواشی دیے گئے ہیں جس سے کتاب کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔

صفحات ۵۴۶ مع اشاریہ قیمت -/۴۵ روپے

ملنے کا پتا: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور